نثار ترابی
صدر، شعبۂ اُردو،
گورنمنٹ کالج آف کامرس، راولپنڈی

جاگے ہیں خواب میں - ایک مختصر تاثر

ABSTRACT

Jaage hain khwaab mein: **a brief analysis**
By Nisar Turabi, Head of Urdu Department, Govt. College of Commerce, Rawaplindi.

Out of the Western literary genres, novel - considered a sophisticated form of story (daastaan) - has gained a great deal of acceptance and fame in the sphere of Urdu prose. Contrary to the mysterious and unreal environment of Daastaan, the live characters of novel mirror life colors in a real and clear-cut style. Among the litterateurs who have highlighted and interpreted different aspects of life giving new meaning thereto, one name is certainly of Akhter Reza Saleemi. In addition to his two successful poetry collections already having been published, his first-ever exciting novel "Jaage hain khawab mein" has established his skill as a prose writer as well. Written against the backdrop of Syed Ahmad Shaheed movement, Hazara culture and civilization has been depicted in quite a new manner. The article under review discusses some literary aspects of this novel.

اختر رضا سلیمی کا یہ ناول اسم بہ مسمّٰی ہے۔ انہوں نے غالبؔ کے مصرعے سے صرف کتاب کا نام ہی نہیں لیا بلکہ غالباً خیال بھی غالب ہی سے لیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں یہ شعر بھی درج کیا ہے۔

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شُہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں (۱)

اس شعر کو پڑھنے کے بعد کتاب بینی کے باقاعدہ آغاز سے قبل ہی جب فہرست ابواب پر نظر پڑتی ہے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک خواب، ''جو حقیقت میں بھی موجود تھا''، ''خواب کا پس منظر''، ''خواب کا پیش منظر''، ایک خواب، ''جو خواب نہیں تھا'' جیسے ابواب اور بعد ازاں ''خواب در خواب'' اور دیگر تمام ابواب اس ذیل میں آ گاہ کرتے نظر آتے ہیں کہ شعور، لاشعور، عدم، وجود، خواب، حقیقت، اس کا پس منظر اور پیش منظر سبھی موجود ہیں۔ ناول میں اتنی مشکل زمین کو برتنا یقیناً دل گردے کا کام ہے۔

پہلے باب کے آغاز ہی میں جو منظر نگاری ہے جہاں راوی اپنی تنہائیوں کی وہ کیفیات رقم کرتا ہے جو اسے نہایت عزیز ہیں، ہر چند کہ بادی النظر میں اس میں سے کئی چیزیں عوام الناس کے لیے معمول ہیں یا کم از کم کچھ خاص نہیں

ہوتیں۔یعنی پیش منظر کے بجائے پس منظر زیادہ اہم ہے۔تنہائی میں راوی نے خیالات کے واسطے سے جو جہاں آباد کر رکھا ہے اس پر غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو(۲)

دوسری چیز جو فوری طور پر قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے وہ اختر رضا سلیمی کی منظر نگاری اور جزئیات نگاری ہے۔اسی منظر نگاری کے بیچ وہ علاقائی روایات بیان کرتے ہوئے قاری کو گویا اپنے ساتھ ہی مذکورہ مقام تک کھینچ لائے ہیں۔یہی نہیں بلکہ مذکورہ علاقے کا طرزِ زندگی،ثقافت،لوگوں کے اطوار اور ان کی عادات اور وہاں کے روزمرہ کی متعدد قابلِ ذکر اشیاء و واقعات کو بھی کہانی کا حصّہ بناتے ہیں۔

اس ناول کے حوالے سے ایک اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ہر چند مرکزی کردار وہی رہتا ہے،لیکن ناول میں ابواب اس سلیقے سے باندھے گئے ہیں کہ ہر ذیلی واقعے کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے تو معمولی سے ردّوبدل کے ساتھ ہر باب ایک الگ افسانے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔یعنی ہر واقعے کے ذیل میں پیش کی جانے والی جزئیات نگاری، ناول کے مرکزی بیانیے سے الگ رہ کر بھی اپنی خصوصیت برقرار رکھتی ہے۔

ناول میں فطری حسن کا بیان بھی جزئیات کی لذّتوں سے بھرپور ہے اور فطری خواہشات اور ان کے حصول کے بعد تسکین کا فطری انداز بھی تہذیبی اقدار میں رہتے ہوئے نہایت موثر طریقے سے نبھایا گیا ہے۔مثال کے طور پر یہ مثال ملاحظہ ہو۔

''میں مہر و ہوں
ہزاروں برس سے یونہی اپنی رو میں بہے جا رہا ہوں
مری اور گلیات کی چھاتیوں سے نکلتی ہوئی دودھیا آبشاریں مرے ظرف کو آزماتی رہی ہیں۔
مگر میں نے اپنے کنارے پہاڑ ایستادہ رکھے تاکہ چاہوں تو بھی آپے سے باہر نہ ہو پاؤں میں(۳)''

اور اگر فطری خواہشات اور تسکین کے پہلو دیکھنے کی تمنّا ہو تو یہ نثر پارہ دیکھئے۔

''ظفر نے لنگ کے ساتھ رکھی ہوئی لالٹین کا شیشہ انتہائی احتیاط سے اٹھا کر پھونک ماری اور پورا کمرہ اندھیرے کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔جس میں وہ دونوں ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔آہستہ آہستہ ان کے سانس پھولنے لگے۔یہاں تک کہ ان کے تیز سانسوں کی آواز اندھیرے کے اس اتھاہ سمندر سے باہر جلتے ہوئے دیوں کو بھی صاف سنائی دینے لگی۔اتھاہ اندھیرے کے اس سمندر میں ان آوازوں کے

عین عروج کے لمحوں میں ظفر علی کے ذہن میں روشنی کا ایک کوندا سا لپکا۔ جس میں
بیک وقت کئی مناظر ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو رہے تھے۔''

''گرتی ہوئی آبشار
جھلملاتی روشنی
فضا میں بلند ہوتا پتھریلا تخت، اڑتی ہوئی پری
گرتی ہوئی آبشار کے سر پر کھڑی خوبصورت لڑکی
غار کا پتھریلا چبوترا
پتھریلے چبوترے پر انسانی ہتھیلی کی لکیروں سے مماثل لکیریں
خوبصورت ہونٹ
ہونٹوں پر ایک لمبوترا سیاہ تل.....(۴)''

اختر رضا سلیمی کے تمام تخلیقی جواہر اس نثر پارے میں یکے بعد دیگرے نظر آتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے شاعر ہونے کی وصف نے کس تخلیقی جمال کے ساتھ اس بظاہر بیانیہ منظر کو باقاعدہ ایک آزاد نظم کی سی صورت عطا کر دی ہے۔ ان کا تخیل فکری سطح پر بلند اور منظر نگاری اپنے جوبن پر دکھائی دیتی ہے یہ سطریں نثر کی ہیں لیکن الفاظ کو شاعرانہ زاویے سے برتا گیا ہے۔ اس لیے یہ کلام شعریت سے لبریز ہو کر مزید خوبصورت اور دلنشیں بن جاتا ہے۔

ناول کے مرکزی خیال کا واقعاتی تانا بانا چونکہ ہزارہ تہذیب کو اپنا حوالہ بناتا ہے اور اختر کا نسبتی تعلق بھی اس خوب صورت، قدیم تہذیبی اور تاریخی علاقے سے ہے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس علاقائی نسبت سے مصنف نے فطری طور پر استعارے کی راہیں بھی ہموار کی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اس علاقے کی جزئیات کے ساتھ ساتھ روایات کا بھی پاس رکھتے ہیں۔ اگرچہ قاری کے لیے اس حصے کا بیان اس قدر پختہ اور بے ساختہ ہے کہ یکا یک سعادت حسن منٹو کا ''ٹھنڈا گوشت'' اور قدرت اللہ شہاب کا ''نکسر'' یاد آ جاتے ہیں لیکن علاقائی روایات کی پاسداری کے سبب وہ احساسات جن کا منٹو اور شہاب کے یہاں اظہار صراحت کے ساتھ ہوتا ہے، اختر رضا سلیمی اسے باب الکنایہ سے باہر نہیں جانے دیتے۔

ناول میں جب مرکزی کردار زلزلے کو دیکھتا ہے تو اختر رضا سلیمی اس زلزلے میں جمادات، نباتات اور حیوانات کے ساتھ ساتھ انسانی اخلاقی اقدار کو جس دلیری سے تہ و بالا ہوتا دکھاتے ہیں، وہ نہایت فکر انگیز ہے۔ مثال کے طور پر یہ سطریں ملاحظہ ہوں:

''مغرب کے بعد بستی والے اپنے عزیزوں کی تدفین سے پلٹے تو انھوں نے دیکھا
کہ نوجوانوں کا گروپ حسبِ وعدہ کسی دوسری بستی والوں کی مدد کے لیے جا چکا

ہے۔ ملبے سے برآمد ہونے والے زیورات اور دیگر قیمتی سامان سمیت (۵)''

ناول میں قارئین کو وہ سرزمین ہزارہ کی تاریخ سے بھی علامتی طور پر جزیات نگاری کے حسن بیان کی مدد سے آگاہ کرتے ہیں۔ شہدائے بالاکوٹ اور ان کے لشکر میں مرکزی کردار کا بطور گواہ جانا اور پھر ؎

ہم بھی وہیں موجود تھے

کی تفسیر بن جانا جس اہتمام سے بیان کیا گیا ہے کہ اس میں تاریخیت کا رنگ نمایاں ہو گیا ہے۔ ہزارہ کے اس خطے کو اگر تاریخی تناظر میں دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد نے اپنی جس جہادی تحریک کا آغاز ۱۸۲۰ء میں کیا تھا، وتحریک ۱۸۸۴ء تک کسی نہ کسی صورت میں جاری رہی، اس طویل زمانی مدت کے دوران، برصغیر کے اکثر علاقوں میں سید احمد شہید نے انگریزوں اور سکھوں کے خلاف جو جنگیں لڑیں ان جنگوں کے اثرات نے برصغیر کی سیاسی زندگی کو خاص طور پر متاثر کیا۔ جب سید احمد کا انتقال ہوا تو اس وقت تک اس تحریک کا اثر ونفوذ، دکن، مدراس، بنگال اور یوپی تک پھیل چکا تھا۔ مذکورہ تحریک کے اثرات نے بھی زیرِ نظر ناول کے لیے پس منظری مطالعے کا کام کیا، اس پس منظری مطالعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نذر عابد کہتے ہیں۔

> ''ہزارہ دریائے ہرو اور دریائے کہنار کے لوکیل میں لکھے جانے والے اُردو کے اس پہلے ناول میں سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد کے اثرات بہت واضح انداز میں محسوس کیے جا سکتے ہیں (۶)''

اسی طرح جب ناول نگار قاری کو مہاراجہ اشوک، سید احمد شہید اور بعد ازاں سکھوں کے دور سے گزارتے ہوئے لاتا ہے تو فقط تاریخ ہی بیان نہیں کرتا، بلکہ اس تلخ حقیقت کا بھی برملا اظہار کرتا ہے کہ تاریخ بڑے لوگوں کا اعمال نامہ ہے اور ان کی تقدیر ہر دور میں قریباً یکساں رہتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ جملے ملاحظہ ہوں۔

> ''تم کب سے مہاراجہ کی ملازمت میں ہو؟
> ٹھیک سے تو یاد نہیں مگر کافی عرصہ سے۔
> اس سے پہلے تم کیا کرتے تھے؟ اس سوال پر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور کچھ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔
> جی میں اس سے پہلے.....
> اس سے پہلے میں خلیفہ سید احمد بریلوی کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنے بائیں طرف دیوار پر آویزاں قل شریف کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اس رسم الخط سے اسے یاد آیا کہ وہ خلیفہ کے ساتھ تھا(۷)۔''

غرض یہ کہ ناول اپنے اسلوب میں سرزمین ہزارہ کی تاریخ، ثقافت، تہذیبی ورثہ، تمدّنی رنگ، حسن فطرت، حسن سیرت، انسان کی سخاوت وشقاوت کا بیان، مسجع کلام، بے لاگ تنقید، منظر نگاری، جذبات کی ترجمانی اور سبق آموز باتوں کی ایسی امثال رکھتا ہے جس نے اسے اپنے عہد کے معاصر ناولوں میں ایک قابلِ ذکر حیثیت عطا کر دی ہے۔اس اعتبار سے اگر ہم یہ کہیں کہ اختر رضا سلیمی جس طرح معاصر اُردو شعراء میں اپنی پہچان کے رنگ بڑی حد تک واضح کر چکے ہیں اسی طرح نثری میدان میں بھی ان کی تخلیقی توانائیوں نے مذکورہ ناول کے توسط سے اپنی جداگانہ شناخت کے امکانات روشن کر دیئے ہیں۔دانیال طریر نے اختر کے فکر وفن پر بات کرتے ہوئے کہا تھا اور بجا کہا تھا کہ:

> ''اختر رضا سلیمی ادب کے سنجیدہ قاری کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔یہ پہلا مرحلہ اس نے وقت پر طے کر لیا ہے۔لیکن آگے کے مراحل زیادہ صبر آزما اور محنت طلب ہیں(۸)''

حواشی:

(۱) غالب، اسداللہ خاں، دیوانِ غالب (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، جنوری ۲۰۱۵ء)، ص ۱۰۰۔
(۲) ایضاً، ص ۱۲۲۔
(۳) اختر رضا سلیمی، مشمولہ جاگے ہیں خواب میں، دستاویز (لاہور: مارچ ۲۰۱۵ء)، ص ۲۲۔
(۴) ایضاً، ص ۹۹۔
(۵) ایضاً، ص ۱۱۱۔
(۶) نذر عابد، ڈاکٹر، جاگے ہیں خواب میں کا تجزیاتی مطالعہ، مشمولہ آرٹس اینڈ لٹرز (تحقیقی مجلہ اُردو) پشاور، شمار ۱۵، (۲۰۱۵ء)، ص ۱۳۔
(۷) اختر رضا سلیمی، محوّلہ بالا، ص ۱۸۳۔
(۸) دانیال طریر، اختر رضا سلیمی کا محتاط رویہ، مشمولہ معاصر تھیوری اور تعینِ قدر (کوئٹہ: مہر درانسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، اکتوبر ۲۰۱۲ء)، ص ۱۹۳۔

مآخذ:

سلیمی، اختر رضا، مشمولہ جاگے ہیں خواب میں، دستاویز، لاہور: مارچ ۲۰۱۵ء۔
طریر، دانیال، اختر رضا سلیمی کا محتاط رویہ، مشمولہ معاصر تھیوری اور تعینِ قدر، کوئٹہ: مہر درانسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، اکتوبر ۲۰۱۲ء۔
عابد، نذر، ڈاکٹر، جاگے ہیں خواب میں کا تجزیاتی مطالعہ، مشمولہ آرٹس اینڈ لٹرز (تحقیقی مجلہ اُردو) پشاور، شمار ۱۵، ۲۰۱۵ء۔
غالب، اسداللہ خاں، دیوانِ غالب، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، جنوری ۲۰۱۵ء۔